خودکشی یا قطع حیات

کیا اسلام نے مریض کو اس کی اجازت دی ہے؟

سید جلال الدین عمری

جن مسائل و مصائب سے انسان روز اوّل سے دوچار ہے ان میں بیماری اور مرض کا مسئلہ بھی ہے۔ مرض کی نوعیت کے لحاظ سے اُس کی پریشانیوں اور کلفتوں میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے۔ چھوٹے موٹے اور معمولی امراض سے جلد نجات مل جاتی ہے۔ بسا اوقات دوا دارو کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی، طبیعت خود اس کے دفعیہ کا سامان کرتی رہتی ہے، لیکن مرض زیادہ سخت ہوتا ہے تو اُس کے ازالہ کے لیے حکیم اور ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کبھی مرض کا ایک ہی جھٹکا تارِ حیات کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور خویش و اقارب حسرت و یاس سے تڑپ تڑپ کر جدائی کا دل خراش منظر دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔

مرض کی بعض صورتیں بڑی بھیانک اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ انسان مدتوں اس میں گرفتار رہتا ہے۔ رات دن اس کے صدمے برداشت کرتا ہے۔ برسہا برس گزر جاتے ہیں نہ تو زندگی کا فاصلہ طے ہوتا ہے اور نہ بے چینی اور کرب سے نجات ملتی ہے۔

کچھ اس طرح کی دقتیں ان لوگوں کو بھی پیش آتی ہیں جو مفلوج اور معذور پیدا ہوتے ہیں یا زندگی کے کسی مرحلے میں جن کے ہاتھ پیر غائب یا کم از کم بے کار ہو جاتے ہیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہ جاتے کبھی قوت گویائی بھی چھن جاتی ہے، اپنی ضروریات کا اظہار تک نہیں کرپاتے، خود سے انھیں پورا کرنا تو ممکن ہی نہیں ہوتا ہے۔ جب تک زندہ رہتے ہیں خویش و اقارب اور سماج کے لیے بوجھ بنے رہتے ہیں۔

بڑھاپا جب ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو بھی یہی صورت حال پیش آتی ہے۔

دماغ معطل ہوجاتا ہے اور جسمانی قویٰ اپنی توانائی کھو بیٹھتے ہیں۔ طبیعت میں ضد اور چڑچڑاہٹ پیدا ہوجاتی ہے جسے قریب ترین افراد بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سماج کے لیے ان کی افادیت باقی نہیں رہتی۔ زندگی کے لمحات اس احساس کے ساتھ خود بھی گزارتے ہیں کہ ہم بے مصرف ہیں اور دنیا بھی انھیں بے مصرف ہی سمجھتی ہے۔ چنانچہ مغرب میں، جہاں ہر چیز کی قدر و قیمت مادی نقطۂ نظر سے متعین کی جاتی ہے اس طرح کے مفلوج و معذور بوڑھوں کا مسئلہ پریشان کن بنا ہوا ہے اور اُسے حل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کی جارہی ہیں۔

زندگی کا سورج جب غروب ہونے لگتا ہے تو عالم نزع کی کیفیت بھی بڑی سخت ہوتی ہے۔ زندگی اپنے بقا کے لیے جد و جہد کرتی ہے اور موت اپنے تابڑ توڑ حملوں سے اُسے ناکام بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ کشمکش بعض اوقات اتنی سخت اور طویل ہوتی ہے کہ اس کا دیکھنا بھی دشوار ہوتا ہے۔

اس سب کے باوجود مرض کے سامنے انسان نے کبھی سپر نہیں ڈالی، اس کا ہر دور میں اس نے مقابلہ کیا ہے اور اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کی تدبیریں بھی کرتا رہا ہے۔ اسی کے نتیجے میں طب نے ترقی کی اور بعض ان میدانوں میں کامیابیاں حاصل کیں جن میں پہلے وہ ناکام تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی بہت سے امراض کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔

جب کوئی مرض لاعلاج اور ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو دنیا نے دیکھا ہے اور دیکھتی رہی رہتی ہے کہ بعض لوگ گھبرا کر موت کی آغوش میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور خودکشی کو اپنے دکھ درد کا مداوا سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ اقدام اتنی خاموشی سے اور اچانک ہوتا ہے کہ جانے والا یہ پوچھنے کا موقع بھی نہیں دیتا کہ ؏

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اسلام نے انسان کو کسی بھی حال میں خودکشی کی اجازت نہیں دی ہے۔ وہ اس بات کو ناجائز اور حرام ٹھیراتا ہے کہ آدمی اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرلے لیکن آئیے یہ دیکھیں کہ خودکشی کے حق میں کیا دلائل دئے جاتے ہیں اور ان میں کتنا وزن ہے۔

خودکشی کے جواز کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جن چیزوں پر انسان کو ملکیت کا حق حاصل ہے اُن میں اس کی اپنی زندگی بھی ہے۔ اس کے اس حق کو دنیا کے سب ہی قوانین تسلیم کرتے ہیں۔

اس حق کو ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو ختم کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہے۔ کسی حق سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔

لیکن یہ بات اتنے عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ انسان کو کوئی بھی حق مطلق حاصل نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنے حق کو غلط طور پر استعمال کرے تو اس پر پابندی لگائی جاتی ہے اور لگائی جانی ہی چاہئے۔ ورنہ اس سے بڑی سماجی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ایک کارخانہ دار جس پر اُسے مالکانہ حق حاصل ہے اور جس میں دس بیس یا سو پچاس افراد کام کر رہے ہیں اُسے اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ جب چاہے کارخانہ کو آگ لگا کر اپنے گھر بیٹھ جائے۔ اس لیے کہ گو وہ کارخانہ کا مالک ہے لیکن بہت سے دوسرے انسانوں کے حقوق اس سے وابستہ ہیں۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرسکتا جس سے یہ حقوق متاثر اور مجروح ہوں۔ انسان کو جو بنیادی حقوق حاصل ہیں اُن سب کے ساتھ اس طرح کی پابندیاں موجود ہیں۔

اب خودکشی کے مسئلہ پر سوچئے۔ ہر شخص سماج میں ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن ایک دو نہیں بہت سے افراد سے بندھا ہوا ہے اور ان سے دور یا نزدیک کا تعلق رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے اس پر کچھ ذمہ داریاں اور کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان کی ادائیگی کا وہ پابند ہے۔ جو شخص خودکشی کرتا ہے سماج کی طرف سے عائد ہونے والے ان حقوق اور ذمہ داریوں سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے، اور اپنے قریب ترین افراد کے حقوق کو نقصان پہونچاتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ بیماری کی تکلیف میں خودکشی کی نوعیت اس سے مختلف ہے یہ ایک ایسے فرد کا ذاتی مسئلہ ہے جو کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہونچانے کی حیثیت میں ہرگز نہیں ہے۔ وہ زندگی کے حق کو اس لیے ختم کر رہا ہے کہ وہ تکلیف کا باعث بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے وہ سخت اذیت محسوس کر رہا ہے۔ وہ معاشرہ کے حقوق ادا کرنے کی پوزیشن ہی میں جب نہیں ہے تو اُن سے گریز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

خاص اس مسئلہ میں حقوق کا سوال نہ بھی اٹھے تو اس پر اس پہلو سے غور کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے کہ سماج پر اس کے کیا اثرات پڑسکتے ہیں؟ کیا انسان اس کی وجہ سے معاشرے میں کوئی بری مثال تو نہیں قائم کر رہا ہے؟

زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر موجودہ نقطۂ نظر سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ وہ اس دعویٰ ہی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان اس دنیا میں کسی بھی چیز کا حتیٰ کہ اپنی ذات

کا مطلق مالک ہے اور وہ اس میں اپنی آزاد مرضی سے تصرف کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ پوری دنیا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اس لیے وہی اس کا حقیقی مالک بھی ہے۔ اس دنیا میں انسان خود سے نہیں آیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا ہے اور اُسی نے اُس کے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا ہے، اس لیے وہی اس کی ذات پر مالکانہ اقتدار بھی رکھتا ہے۔ انسان اپنی ذات یا اپنے کسی اقدام کے بارے میں کوئی آزادانہ فیصلہ نہیں کر سکتا، ورنہ اس کی حیثیت ایک مجرم کی ہوگی جو دوسرے کی چیزوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرے اور ان کے بارے میں فیصلے صادر کرتا پھرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہی نہیں ہے کہ اسے کب تک دنیا میں رہنا ہے اور کب یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ جس نے زندگی دی ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ زندگی کب واپس لے لی جائے۔

کسی شخص کو تکلیف یا زحمت برداشت کرنے پر مجبور کرنا اور اس سے نجات حاصل کرنے کی اجازت نہ دینا ایک طرح کی سنگ دلی اور شقاوت معلوم ہوتی ہے۔ کیا اسلام نے مریض کو خودکشی سے روک کر اسی شقاوت کا مظاہرہ کیا ہے؟ کیا اُسے مریض کے دکھ درد اور تکلیف کا احساس نہیں ہے؟

قرآن و حدیث کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ اسلام مرض کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل سے بخوبی واقف ہے اور اُسے مریض سے پوری ہمدردی ہے۔ چنانچہ ایک بچے کے دنیا میں آتے وقت اس کی ماں جو تکلیف اٹھاتی ہے اس کا قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ذکر کیا ہے[۱]۔ حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ حمل اور زچگی کی موت شہادت کی موت ہے[۲]۔ بیماری اور معذوری کو ایک حقیقت مان کر وہ چلتا ہے۔ بڑھاپے میں انسان کی قوتیں جس طرح جواب دے جاتی ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انسان کمزوری و ناتوانی کی اسی حالت کو پہونچ جاتا ہے جس حالت سے اس نے عہد طفلی میں اپنے سفر حیات کا آغاز کیا تھا[۳]۔ موت کی شدائد اور جان کنی کی تکالیف کا بھی اس نے متعدد بار ذکر کیا ہے[۴]۔ وہ اس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کس طرح

۱؎ ملاحظہ ہو۔ لقمان: ۱۴۔ الاحقاف: ۱۵

۲؎ ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب فضل من مات بالطاعون۔

۳؎ النحل: ۷۰، فاطر: ۱۴، یٰسٓ: ۶۸ ۔ ۴؎ القیامہ: ۲۶۔۳۰، الواقعہ: ۸۳

انسان مجبور و مضطر ہو کر اپنی مشکلات میں خدا کو پکارتا ہے اور وہ اس کی مدد کرتا ہے۔[1]

یہی نہیں کہ اسلام کو مریض کے دکھ درد اور اس کے مسائل و مشکلات کا احساس ہے بلکہ اس نے نظامِ شریعت میں اس کی بھرپور رعایت کی ہے۔ اس کا دائرہ عبادات سے لے کر معاشرت اور غلبۂ دین کی مساعی تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک مثال سے بات زیادہ واضح ہو سکتی ہے۔ پانچ وقت کی نماز فرض ہے اس کے ادا کرنے کے لیے وضو شرط ہے۔ مریض کے لیے پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔[2] نماز کے ادا کرنے میں ہاتھ پیر اور دوسرے اعضاء کو حرکت دینی پڑتی ہے۔ مرض کی وجہ سے آدمی اس حرکت کے قابل نہ ہو تو صرف اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ غشی طاری ہو جائے تو چھوٹی ہوئی نمازیں بعد میں ادا ہوں گی۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں کسی نماز کا وقت نکل گیا تو وہ نماز ہی اس سے ساقط ہو جائے گی۔ البتہ فقہائے احناف کے نزدیک ایک شب و روز کی نمازیں (پانچ نمازیں) بے ہوشی کی حالت میں چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو گی۔ اگر بے ہوشی اس سے زیادہ عرصے کے لیے ہو تو ان کی قضا کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص مستقل بے ہوشی کے عالم میں ہو اس کا حکم مجنون کا ہو گا اور وہ غیر مکلف قرار پائے گا۔[3]

اس ہمدردی اور محبت کے باوجود وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی بھی تکلیف کی وجہ سے آدمی خودکشی کی راہ اختیار کرے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں بڑی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر محاذ پر وہ دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ اس کی جرأت کو دیکھ کر ہر طرف سے تحسین و تعریف ہونے لگی بالآخر وہ لڑتے لڑتے بری طرح زخمی ہو گیا۔ زخم کی تکلیف برداشت نہ کر سکا اور اپنی ہی تلوار کی نوک سینے میں پیوست کر لی اور آن کی آن میں ختم ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہنم کا مستحق قرار دیا۔[4]

حضرت جابر بن سمرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص بیمار تھا۔ اچانک گھر میں شور ہوا تو اس کے پڑوسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہیں اس کی خبر کیسے ہوئی؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے خود دیکھا ہے (یعنی اس کے گھر سے پہنچنے

---

[1] النمل: ۶۲ [2] المائدہ: ۶

[3] ملاحظہ ہو: ابن قدامہ: المغنی ۱/ ۴۰۰ – ۴۰۱۔ ہدایہ، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ المریض ۱/ ۱۴۲ – ۱۶۱

[4] بخاری کتاب الجہاد باب لایقال فلان شہید۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم قتل الانسان نفسہ الخ

چلانے کی آواز سنی ہے) آپ نے فرمایا نہیں! ابھی اس کا انتقال نہیں ہوا ہے۔ اس نے دوبارہ اسی طرح کا شور سن کر آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے اس بار بھی یہی فرمایا کہ اس کا انتقال ابھی نہیں ہوا ہے۔ پھر شور بلند ہوا اور خود اس کی بیوی نے اس کے مرنے کی خبر دی اور بتایا کہ کس طرح موت ہوئی ہے تو اس نے لعنت بھیجی۔ خود اس نے جا کے دیکھا کہ نیزہ کے پھل سے جو چوڑا تھا اس نے خودکشی کی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تفصیل معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا میں اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھوں گا۔[1]

خودکشی تو بڑی بات ہے اسلام نے مرض کی تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ حضرت خبابؓ کو بطور علاج گرم لوہے سے سات داغ دئے گئے تھے۔ اس سے انھیں سخت تکلیف تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ورنہ تکلیف اتنی سخت ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے موت کی دعا کرتا۔[2]

اسلام نے خودکشی کو جن وجوہ سے حرام قرار دیا ہے اُن سب سے یہاں بحث نہیں ہے۔ صرف مریض کے تعلق سے بعض باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو حیات مستعار ملی ہے وہ ایک امانت ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس امانت کی حتی الامکان حفاظت کرے اور اُسے ضائع ہونے سے بچائے۔ اسلام نے جو چیزیں حرام کی ہیں ان کے استعمال کو اُس نے سخت گناہ کا باعث قرار دیا ہے اور بعض صورتوں میں اس نے ان پر دنیوی سزا بھی رکھی ہے لیکن انسان کی زندگی اگر خطرہ میں ہو اور حرام کے استعمال کے بغیر اس کا بچانا مشکل ہو جائے تو وہ اس کے استعمال کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بعض فقہاء نے یہاں تک کہا ہے کہ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لیے حرام چیز کا استعمال ضروری ہے[3] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے بقا اور تحفظ کو اسلام کتنی اہمیت دیتا ہے۔

اسی طرح اسلام چاہتا ہے کہ مرض کا علاج حلال چیزوں سے ہو جنھیں وہ طیب اور پاک چیزیں قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی مرض کا علاج پاک چیزوں سے نہ ہو سکے تو فقہاء نے ناجائز چیزوں کے بھی استعمال کی اجازت دی ہے۔[4]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب الامام لایصلی علی من قتل نفسہ [2] بخاری کتاب المرضی باب تمنی المریض الموت

[3] ابن قدامہ، المغنی ۵۹۵/۸ [4] ردالمحتار علی الدرالمختار ۲۹۸/۴

یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر انسان کا امتحان ہوتا ہے اور طرح طرح سے ہوتا ہے دنیا کا کوئی فرد اس سے محفوظ نہیں ہے۔ یہ امتحان کارزار حیات میں انسان کے قدم رکھنے کے وقت سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ کبھی ماحول سازگار نہیں ہوتا، کبھی صحت ساتھ نہیں دیتی، کبھی غربت اور افلاس پریشان کرتا ہے، کبھی مال کی ہوس اور عیش و عشرت کی طلب سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی، کبھی جوانی کی لغزشیں اور غلطیاں وبال جان بن جاتی ہیں، کبھی بڑھاپے کے صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں، کبھی رشتہ داروں اور عزیزوں کی جدائی اور کبھی ان کی بے رحمی دیکھنی پڑتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو کچھ اس طرح بنایا ہے کہ یہاں وہی باہمت انسان کامیاب ہوتے ہیں جو مشکلات سے ہراساں نہ ہوں اور عزم و حوصلہ سے اُن کا مقابلہ کرتے رہیں۔ خودکشی اسی کشمکش سے فرار کا نام ہے۔ یہ ایک طرح کی بزدلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس بزدلی کی ہمت افزائی کی جاسکتی ہے؟ کیا نامردی بھی اس قابل ہے کہ اس کی داد دی جائے؟ اگر نہیں ہے تو اسلام سے کیوں توقع کی جائے کہ وہ اس کی تائید و تحسین کرے گا؟

تکلیف، ایک اضافی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت افراد کے لحاظ سے بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے ایسی مثالیں نایاب نہیں ہیں بلکہ روز مل سکتی ہیں کہ ایک شخص نے جس مرض کی تکلیف کو مدتوں برداشت کیا دوسرے کے لیے وہ چند دن میں ناقابل برداشت ہوگئی۔ ایک شخص جس تکلیف پر مسکراتا ہے دوسرا اس پر آنسو بہاتا ہے۔ اگر تکلیف کی وجہ سے خودکشی کی اجازت دے دی جائے تو عجیب و غریب صورتحال پیدا ہو جائے گی اور جرأت و ہمت سے مرض کا مقابلہ کرنے کی جگہ زندگی ہی کو ختم کرکے اس سے چھٹکارا پانے کا رجحان بڑھے گا۔ کیا اس رجحان کا فروغ پانا کسی سماج کے لیے مفید ہوگا؟ اسی وجہ سے اس ناپسندیدہ اور بزدلانہ عمل کی بیشتر مذاہب نے مخالفت کی اور دنیا کے قوانین نے اسے ایک جرم ہی سمجھا۔

مرض چاہے چھوٹا ہو یا بڑا قابل علاج ہو یا لاعلاج ہر حال میں اسلام نے صبر کی تعلیم دی ہے۔ جو لوگ مذہبی اقدار کی اہمیت نہیں محسوس کرتے ان کے نزدیک یہ ایک بے معنی نصیحت ہے، اور انسان کی قوتِ عمل کو نقصان پہونچاتا ہے۔ لیکن یہ صبر کا غلط تصور ہے۔ صبر اس بات کا نام ہے کہ آدمی مشکلات میں جزع فزع اور گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرے۔ شکوہ شکایت کی جگہ جم کر ان کا مقابلہ کرے جو ممکن تدبیریں اس کے بس میں ہوں ان کو پورے سکون کے ساتھ اختیار کرے اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردے۔ اس سے انسان کی قوتِ ارادی (Will power)

مضبوط ہوتی ہے اور آدمی کے اندر خود اعتمادی اور خدا اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ مریض کے اندر مضبوط قوت ارادی ہو تو وہ مرض کا بڑی ہمت اور پامردی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ جن مریضوں کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے وہ مایوس اور بے صبر مریضوں کے مقابلے میں لمبی زندگی پاتے ہیں۔

صبر کے جذبہ کو اسلام آخرت کے اجر و ثواب کے تصور سے تقویت پہونچاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کارزار حیات میں جو شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر صبر کی راہ اختیار کرے گا اور سخت سے سخت آزمائش میں اس کے احکام کی پابندی کرتا رہے گا آخرت میں اللہ [illegible] کی بے پایاں نعمتوں کا مستحق ہوگا۔

بعض امراض اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں اور اتنے طویل عرصہ تک ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے کہ اس میں مریض کے صبر ہی کا امتحان نہیں ہوتا بلکہ اس کے چاہنے والوں اور خدمت گذاروں کی بھی آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس سے تنگ آنے لگتے ہیں۔ انھیں اس سے ہمدردی باقی نہیں رہتی۔ وہ اس کی زندگی کی تمنا سے زیادہ موت کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان ہی عزیزوں نے اسے کسی تدبیر سے موت کی نیند سلادیا۔ پہلے اسے ایک جرم سمجھا جاتا تھا لیکن آج اس پر بحثیں ہو رہی ہیں کہ اس میں جرم کا کوئی پہلو ہے یا نہیں؟ مغرب میں (Mercy Killing) کی حمایت میں ادارے قائم ہو گئے ہیں اور ہمارے ملک میں بھی اس کی حمایت میں آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ بحث جس مرکزی نقطہ کے گرد گھومتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی مہلک مرض میں مبتلا ہے اور ناقابل برداشت تکلیف اور اذیت جھیل رہا ہے اور جس کی اس مرض سے نجات پانے کی کوئی توقع بھی نہیں ہے کیا اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے یا اُسے کسی تدبیر کے ذریعہ آسانی سے موت کی آغوش میں پہونچا دیا جائے؟ کہا جاتا ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ترقی یافتہ ممالک میں یہ مسئلہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ طبی سہولتوں کی وجہ سے وہاں ایسے مریضوں کو بھی ایک عرصے تک زندہ رکھا جا سکتا ہے جن کا فی الواقع کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ مرض کی تکلیف سے تو نجات نہیں پا سکتے البتہ زندہ رہ سکتے ہیں ایسے سیکڑوں مریض ہیں جو بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ دواؤں نے انھیں مرنے سے روک رکھا ہے۔ لیکن سانس کی آمد و رفت کے علاوہ حیات کے آثار اُن میں نہیں ہیں۔ ان کو کب تک اس حال میں رہنے دیا جائے؟ کیا ان کو ختم کرنا ان کے ساتھ ہمدردی نہ ہوگی؟

جو لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں وہ اس کی قانونی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے بعض شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ مریض خود اس رائے کا اظہار کرے کہ یہ دکھ بھری دنیا اس کے رہنے کے قابل نہیں ہے اور وہ "شاندار موت" مرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو حالت صحت میں تحریری طور پر اپنی یہ رائے قلم بند کرا سکتا ہے کہ اگر وہ اس طرح کے سخت حالات سے دوچار ہو جائے تو اس کی زندگی ختم کر دی جائے۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ کسی مریض کو اس وقت تک ختم نہ کیا جائے جب تک کہ اس کے رشتہ دار خود اس کی درخواست نہ کریں ——— تیسری شرط یہ ہے کہ اس معاملے میں ڈاکٹر کی رائے کا اعتبار کیا جائے جب تک وہ مریض کو ناقابل علاج نہ قرار دے یہ اقدام نہ کیا جائے۔

یہ تینوں باتیں اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں قتل کا جرم اس کے نزدیک اس وجہ سے ہلکا نہیں ہوتا کہ کسی کو اس کی اجازت سے قتل کیا گیا۔ کوئی شخص، جیسا کہ عرض کیا گیا، اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ اس وجہ سے جس طرح اُسے خودکشی کا حق حاصل نہیں ہے اسی طرح اسے یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کو اپنی زندگی ختم کرنے کی اجازت دے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مضطر اور مجبور انسان کو اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ کر کھالے تو وہ اسے کھا نہیں سکتا، اس لیے کہ اس میں اس کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ جس طرح مجبور اور مضطر شخص کی جان محترم ہے اسی طرح اجازت دینے والے کی جان بھی محترم ہے۔

جہاں تک رشتہ داروں کی رائے کا تعلق ہے ایسی مثالیں ناپید نہیں ہیں کہ جو مریض عرصۂ دراز تک لاعلاج پڑے رہتے ہیں بعض اوقات ان کے رشتہ دار ہی کسی نہ کسی تدبیر سے انھیں ختم کر دیتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے پیچھے ہمیشہ اکتاہٹ اور بیزاری کے جذبات ہی کارفرما ہوتے ہیں، مریض کے ساتھ ہمدردی کے جذبات شامل نہیں ہوتے؟

مغرب میں اس طرح کے مریضوں کو ختم کرنے کا جو رجحان ابھر رہا ہے اس کی بڑی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ خاندان بکھر چکا ہے اور افراد خاندان کے درمیان محبت اور ہمدردی کے جو جذبات فطری طور پر پائے جاتے ہیں وہ سرد پڑ چکے ہیں۔ کوئی شخص کسی کی تکلیف میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ وہ اس بات کو مشکل ہی سے سوچ پاتا ہے کہ اگر خاندان کا ایک فرد تکلیف میں گرفتار ہے تو وہ اس کے لیے لیے کیوں پریشان ہو اور اس کی خاطر اپنے عیش اور راحت کو کیوں قربان کرے؟

اسلام نے مریض کے ساتھ ہمدردی اور اس کی خدمت کی ترغیب دی ہے یہ خدمت

قریب ترین افراد پر بعض حالات میں فرض اور مریض کے ایک قانونی حق کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس پہلو سے مریض اس بے بسی سے دوچار نہیں ہوتا جس سے بعض اوقات مغرب میں مریض دوچار ہوتا ہے۔ مریض کی خدمت اسے آرام پہونچانے، اس کے دکھ درد کو کم کرنے اور اسے موت سے بچانے کے لیے ہونی چاہئے۔ موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے لیے نہیں۔ یہی اس کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا ہے اور یہی اسلام کا مطالبہ ہے۔ کسی کے اندر تھوڑی سی رمق حیات باقی رہ گئی ہے تو اسے اس لیے ختم کر دینا کہ وہ تکلیف کے ساتھ خود بھی دنیا سے رخصت ہوجائے ہمدردی نہیں بے دردی ہے۔ زیادتی بہرحال زیادتی ہے، چاہے وہ کتنے ہی خلوص اور محبت کے ساتھ کی جائے اور اس کا ارتکاب کتنے ہی قریب ترین افراد کے ہاتھوں کیوں نہ ہو۔ کسی شخص کو ایک لمحے کی زندگی دینے میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے تو ایک دن پہلے یا ایک لمحہ پہلے اسے ختم کرنے کا بھی اسے کوئی حق نہیں ہے۔ قرآن نے یہ بات صراحت کے ساتھ کہی ہے کہ ہر انسان کی جان قابل احترام ہے، اس کی جان اسی وقت لی جاسکتی ہے جب کہ وہ بعض سنگین جرائم کا ارتکاب کرکے خود ہی اس احترام کو ختم کردے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام : ۱۵۱)

جس نفس کا قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو۔ مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو۔

قرآن وحدیث میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ کیا جرائم ہیں جن کی وجہ سے انسان کی جان کا احترام ختم ہوجاتا ہے اور وہ مباح الدم ہوجاتا ہے۔

یہاں اس پہلو کو بھی کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ انسان مفاد کا بندہ ہے۔ مسائل پر سوچتے وقت خود غرضی اس پر چھا جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ مریض کی خدمت سے نجات پانے اور اس کے مال و دولت پر جلد از جلد قبضہ حاصل کرنے کے لیے اسے ختم کردے۔ اسے مریض کی صحت اور زندگی سے زیادہ اسے دنیا سے رخصت کرنے کی فکر بھی ہوسکتی ہے۔ اس صورت حال میں ناقابل علاج مریض کے رشتہ داروں کو اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کا حق دینے سے بڑی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس سے بہت سے قابل علاج مریض بھی ناقابل علاج قرار پاسکتے ہیں اور مرض کے ناقابلِ برداشت ہونے سے پہلے ہی اس دنیا کو چھوڑنے اور سفر آخرت اختیار کرنے پر مجبور ہوسکتے ہیں۔ اسی خطرے کے پیش نظر اسلام نے یہ اصول مقرر کیا ہے۔ القَاتِلُ لَا يَرِثُ[۱] یعنی قاتل مقتول کی وراثت کا حق دار نہ ہوگا۔ اس

---

[۱] ترمذی، ابن ماجہ۔ یہ حدیث سنداً کسی قدر کمزور ہے۔ لیکن اس مفہوم کی کئی ایک روایتیں آتی ہیں اس وجہ سے فقہاء

حدیث کے الفاظ عام ہیں اس لیے امام شافعی اور فقہائے احناف نے یہاں تک کہا ہے کہ غلطی سے بھی اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو وہ اس کا وارث نہ ہوگا۔

کسی شخص کی زندگی کو ختم کرنے کے لیے اسلام کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ڈاکٹر نے اسے لاعلاج قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر یہ رائے تو دے سکتا ہے کہ مریض قابل علاج ہے یا لاعلاج، اس کی صحت کی توقع کی جاسکتی ہے یا نہیں کی جاسکتی ہے، لیکن اسے یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ مریض کو زندہ رہنے دیا جائے یا اُسے زندگی سے محروم کردیا جائے؟

اسی طرح ڈاکٹر کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ وہ مریض کے رشتہ داروں کی خواہش یا اصرار پر کسی زہریلے انجکشن کے ذریعہ اسے موت کی نیند سلادے۔ ورنہ وہ بھی قتل کے ارتکاب میں شریک ہوگا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو کسی شخص کے قتل کرنے پر مجبور بھی کیا جائے اور اس میں خود اس کی جان جانے کا بھی خطرہ ہو تو اسے قتل نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ گنہگار ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں مجبور کرنے والا قاتل متصور ہوگا اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قتل پر مجبور کرنے والا اور عملاً قتل کرنے والا دونوں ہی قاتل ٹھیریں گے اور دونوں سے قصاص لیا جائے گا۔[۱]

قتل کے لیے ضروری نہیں ہے کہ تلوار کے ذریعہ کسی کے دو ٹکڑے کردیے جائیں یا خنجر گھونپ دیا جائے یا گولی چلادی جائے۔ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ زہر دینا یا کوئی بھی ایسی تدبیر اختیار کرنا جس سے انسان کی جان نکل جائے قتل عمد ہے اور اس پر اس کے احکام نافذ ہوں گے۔[۲]

بعض اوقات مریض دواؤں کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ جس وقت دوائیں بند کردی جائیں وہ دم توڑ دے گا۔ سوال یہ ہے کہ جو مریض شدید کرب میں مبتلا ہے کیوں نہ اس کی دوائیں بند کردی جائیں اور اُسے فطری طریقے سے مرنے نہ دیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے اندر جب تک سانس کی آمدورفت باقی ہے وہ زندہ ہے۔ اس سے زندہ انسانوں کی طرح معاملہ کیا جائے گا اور اس کی زندگی کو ختم کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھانا صحیح نہ ہوگا۔

ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ طب کا مقصد انسان کی زندگی کو بچانا اور اُسے آرام پہونچانا اب تک رہا ہے۔ اور یہی اس کا صحیح مقصد ہے۔ انسان کی زندگی کو ختم کرنے کے لیے اس کا استعمال اس کے مقصد ہی کو بدل کر رکھ دے گا۔ اس کی بعض صورتیں بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں اور مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی شکل میں ہمارے سامنے آرہی ہیں لیکن اس کے بڑے خطرناک نتائج رونما ہوسکتے ہیں۔ صاف بات ہے کہ اگر یہ تصور پیدا ہو جائے کہ مریض کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے تو اسے بچانے کی کوششیں کمزور پڑجائیں گی اور یہ طبی دنیا کے لیے ایک سانحہ سے کم نہ ہوگا۔

= نے اسے اختیار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار ۶/۱۹۴-۱۹۶ | [۱] ملاحظہ ہو ہدایہ: ۳/۳۴۷۔ المغنی: ۷/۶۴۵

[۲] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھی جائے۔ المغنی ۷/۶۳۷-۶۴۴